AL-JAMEI Research Journal
ISSN (Print) 3006-4775 (Online) 3006-4783

https://aljamei.com/index.php/ajrj

Narrative of domestic violence in Urdu fiction

اردو افسانہ نگاری میں گھریلو تشدد کا بیانیہ

سجاد احمد

ویزٹنگ فیکلٹی ممبر، پی ایچ ڈی اردو سکالر، فیڈرل اردو یونیورسٹی اسلام آباد

منظور حسین (ظارف نکانی)

ایم فل، اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

ڈاکٹر محمد عرفان احسان پاشا

اسسٹنٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

Abstract

The short story (Afsana) emerged as a prominent genre in Urdu literature, though storytelling had long been a part of the subcontinent's cultural fabric. Ancient texts like Mahabharata, Rigveda, and Arthashastra reflect this tradition. With the arrival of Muslims, the Arabic tradition of storytelling gained momentum and eventually merged into Urdu literature due to the language's expressive capacity. The classical Urdu narrative began with Sab Ras, rich in fantasy, curiosity, and exploration. However, after the 1857 war, societal changes led to the decline of storytelling as a leisure activity, paving the way for the Urdu novel and, eventually, the short story. The modern short story, shaped by the mechanical and scientific spirit of the age, focuses on a single cohesive unit and concludes effectively. It has become one of the most popular genres in Urdu, capturing the realities of domestic struggles, poverty, social injustices, and especially the plight of women forced to step out of their homes. These themes are now powerfully reflected in contemporary Urdu short stories.

Keywords: Urdu short story, Storytelling tradition, 1857 societal change, Classical Urdu narrative, Women's issues in literature, Realism in Urdu fiction, Social commentar

اردو ادب میں افسانہ بطور صنف وجود میں آیا۔اس سے پہلے برصغیر میں کہانی سننے کا رواج تھا۔ مہابھارت، رگوید، ارتھ شاستر وغیرہ انہی کہانیوں کی ذیل میں آتی ہیں۔عرب کی داستان کی روایت کو مسلمانوں کے دور حکومت میں فروغ حاصل ہوا۔لیکن اردو زبان وسیلہ اظہار ہونے کی وجہ سے یہی روایت اردو میں چلی۔اردو میں، سب رس، داستان نویسی کا آغاز ہوا۔یہ داستانیں تجسس حیرت و تلاش و جستجو سے لبریز ہوتی ہیں۔1857ء میں برصغیر کے حالات زندگی تبدیل ہوئے۔جب تفریح مہیا کرنے کے مواقع کم ہونے لگے تو داستان کی اہمیت میں کمی واقع ہوئی۔اور اُردو ناول کا دور شروع ہوا۔واقعات میں ترتیب و تنظیم آغاز پھیلاؤ سب سائنسی دور کے میکانیکی نظام کا پر تاوہے۔انہی تقاضوں نے مختصر افسانے کے لیے راہ ہموار کی۔ مختصر افسانے میں کہانی ایک اکائی کو ابھارتی اور ختم ہو جاتی ہے۔افسانہ اُردو ادب کی ایک مقبول ترین صنف ہے۔ہمارے معاشرے میں گھریلو حالات، غربت، تنگ دستی، محرومیوں اور مہنگائی کے ہاتھوں مجبور عورت جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو اس بیتنے والے تمام واقعات کو آج کے دور میں افسانوں بھرپور بیان کیا جاتا ہے۔

اردو افسانے کا مفہوم: سماجی شعور کے آئینے میں

فکشن یا افسانہ کے لغوی معنی قصہ کہانی کے علاوہ سر گزشت، طبع زاد خیالی بات یا بیان کے ہیں۔ ابتدا میں اردو افسانے کا مخصوص نام رائج نہیں تھا۔کوئی اسے کہانی کہتا اور کوئی داستان۔بعد میں مختصر افسانے کا نام رائج ہو گیا۔اس حوالے سے آج بھی اردو افسانے کے دو گروہ ہیں۔ مختصر افسانہ اور طویل مختصر افسانہ یہ دونوں اصطلا میں الفاظ اور صفحات کی کمی کو ظاہر کرتی ہیں۔صنف افسانہ کی تعریفیں انگریزی ناقدین کی نظر میں دیکھی جائیں تو اس سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ شروع میں افسانہ الفاظ اور صفحات کے لحاظ سے مختصر ہوتا تھا۔

ابتداء دور سے ہی اردو میں افسانہ داستان کی شکل میں موجود تھا۔ قدیم افسانہ اور جدید افسانہ میں فرق یہ ہے کہ قدیم افسانہ مافوق الفطری عناصر پر مشتمل ہوتا تھا۔ جبکہ موجودہ دور کے افسانہ میں روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔مختلف ناقدین نے افسانے کی تعریف میں مختلف بیان دیئے ہیں۔جن کی جانب جانے سے پہلے اس کی باقاعدہ لغت میں تعریف دیکھے تو اردو کی سب سے اہم ادبی لغت فرہنگ آصفیہ "میں مولوی سید احمد دہلوی نے درج ذیل تعریف بیان کی ہے:

”افسانہ: اسم مذکر (ا) حکایت بے اصل قصہ، کہانی، فھڑاہوا قصہ۔ سر گزشت حال، ماجرا۔“(ا(

انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔افسانہ ایک ایسی مختصر تحریر کا نام ہے جس میں کسی واقعے، کردار یا لمحے کی جھلک نظر آتی ہے۔اردو زبان میں افسانہ انگریزی ادب کے اثر سے آیا۔ مغربی زبانوں میں افسانے سے پہلے طویل قصے کہانیاں اور ناول لکھنے کا رو آج تھام لیکن جیسے ہی انسان مصروف ہوتا گیا تو کسی ایسی صنف ادب کی ضرورت محسوس ہوئی جو کم سے کم وقت میں پڑھی جا سکے اور پڑھنے والے کو مسرت اور تسکین کے لمحات میسر کر سکے، چنانچہ اردو افسانہ لکھا جانے لگا جس کے اثرات ہندوستان میں بھی در آئے۔بقول نورین رزاق:

”اردو افسانے کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا۔ ہمارے ہاں یہ صنف مغرب سے آئی ہے لیکن اُردو افسانے کے ابتدائی نقوش داستانوں اور مثنویوں میں نظر آتے ہیں۔“(۲(

ادب میں شارٹ سٹوری کی بدولت اردو میں افسانہ بطور صنف وجود میں آیا۔ لیکن اس سے پہلے برصغیر میں کہانی سننے اور لکھنے کا رو آج تھا۔ مہابھارت، رگوید، ارتھ شاستر وغیرہ انہی کہانیوں کی زیل میں آتی ہیں۔ عرب کی داستان کی روایت کو مسلمانوں کے دور حکومت میں فروغ حاصل ہوا لیکن اردو زبان وسیلہ اظہار ہونے کی وجہ سے یہی روایت اردو میں چلی گئی۔ اردو میں ”سب رس“ سے داستان نویسی کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کی ابتداء دکن سے ہوئی۔ سبرس کے بعد باغ و بہار، آرائش محفل، رانی کیتکی کی

کہانی، فسانہ عجائب، گل صنوبر اور داستان امیر حمزہ زیادہ معروف ہیں۔ یہ داستانیں تجسس، حیرت اور تلاش و جستجو سے بھرپور ہیں۔ ان داستانوں میں قدیم دور کے انسانوں کی سوچ اور عمل کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں برصغیر میں حالات تبدیل ہوئے۔ جب تفریح مہیا کرنے کے مواقع کم ہونے لگے تو داستانوں کی اہمیت میں کمی آگئی۔ اور ناول کا دور شروع ہو گیا۔ واقعات میں ترتیب و تنظیم، آغاز پھیلاؤ سب سائنسی دور کے میکانکی تقاضوں کا پرتو ہے۔ انہی تقاضوں نے مختصر افسانے کے لیے بھی راہ ہموار کی۔ مختصر افسانے میں کہانی ایک اکائی کو ابھارتی اور ختم ہو جاتی ہے۔

افسانہ اردو ادب کی سب سے مقبول ترین صنف ہے۔ اور یہ تمام اصناف سخن میں اظہار کی کامیاب ترین شکل ہے۔ افسانے کا وجود جدید دور کے انسانوں کے مسائل کی بنا پر سامنے آیا۔ دور جدید نے جہاں انسان کو ذہنی وسعت عطا کی ہے وہاں بہت سی پیچیدگیوں کو بھی جنم دیا ہے۔ زندگی کے روز بروز بڑھتے ہوئے تقاضوں اور بدلتی اقدار نے ان کو مختلف مسائل سے دوچار کیا۔ ان مسائل میں ایک مسئلہ وقت کی کمی کا بھی تھا۔ صنعتی انقلاب اور سائنسی ترقی نے انسانی فکر کا دھارا بدل دیا۔ افکار و مسائل کے انبار میں دبا ہوا انسان نئی زندگی سے آشنا ہوا تو اس کے اثرات ادب پر بھی مرتب ہونا ضروری تھے۔ ادب کی دیگر اصناف کی طرح داستان گوئی بھی متاثر ہوئی۔ ناول کی لمبی اڑان کی جگہ افسانے کے اختصار نے لے لی۔ افسانہ جدید دوڑ کے مزاج کا مظہر بھی ہے اور اس زمانے میں زندگی گزارنے والے انسان کے جذباتی اور نفسیاتی تقاضوں کی تکمیل کا باعث بھی۔ اردو میں افسانے کی روایت مغرب سے آئی ہے۔ اور اتنی تیزی سے پروان چڑھی کے دیکھتے ہی دیکھتے نثر کی ساری اصناف پر بھی حاوی ہو گئی اور آج یہ صنف اتنی مستحکم نظر آتی ہے کہ اس پر صدیوں پرانی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

مختصر افسانوی کی تعریف کو اردو لغت بورڈ نے اس طرح بیان کیا ہے:

”وہ قصہ، کہانی، داستان، وہ کتاب جس میں کوئی داستان یا قصہ لکھا ہو۔۔ ناول کے مقابلے میں ایک مختصر کہانی جس میں زندگی کا کوئی خاص رخ مختصر طور پر پیش کیا جائے۔“(3)

افسانہ نگاری ایک ایسی صنف ہے جو زندگی کے حقائق کو بیان کرتی ہے اور زندگی کا مشاہدہ قریب سے کرتی ہے۔ معاشرے اور فرد کے روابط کو موضوع بناتی ہے۔ نفسیاتی کیفیات اور ماحول کے اثرات کو پیش کرتی ہے۔ اس اعتبار سے افسانہ نگاری کے رجحانات اور تجربات کا حقیقی مطالعہ صنف افسانہ ہی نہیں بلکہ برصغیر کے بسنے والے افراد کی ذہنی و معاشرتی تاریخ کا

مطالعہ اور تجربہ بن جاتا ہے۔ افسانہ چونکہ معاشرتی اصلاح کا ایک وسیلہ ہے لہٰذا اس کو مقصدیت سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

ہر دور میں افسانہ نگاروں کے دو زاویے رہے ہیں اور یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ ان میں سے پہلا ارضی رجحان کا عالم بردار ہے۔ اس زاویے کا حامل افسانہ نگار مظاہر زندگی کو بہت قریب سے دیکھ چکا ہوتا ہے۔ یہ انداز نظر گویا خوردبین کی مدد سے معاشرے اور اس کے کرداروں کا گہرا جائزہ لینے کی ایک صورت ہے۔ دوسرا زاویہ ایک متخیل نظر کا حامل ہے۔ اس کے زیر اثر افسانہ نگار ایک خاص مقام یا نقطے پر نگاہ مرکوز کرنے کی بجائے سارے ماحول کا مجموعی طور پر احاطہ کرتا ہے۔ یہ انداز دور بین سے معاشرے کے کرداروں کا جائزہ لینے کی مانند ہے۔

حقیقت نگاری کے دور سے آج تک افسانے کی تنقید کو دریافت کرنے اور اس سے مرتب کرنے کے لیے افسانے کے متن سے زیادہ افسانہ نگار کے نظریات کی توضیحات کی طرف توجہ کی گئی ہے۔ اردو افسانے نے سیاسی غلامی، ماشرتی پسماندگی اور ذہنی اور جذباتی زلزلوں سے ماموردنیا میں آنکھ کھولی یوں اپنے اغاز میں ہی یہ اپنے لب ولہجہ طرز احساس اور تدبیر کاری کے اعتبار سے دو واضح منطقوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک منطق رومان کا تھا جہاں خواب وخیال اپنی رنگینیاں بکھیرتے اور شیرینیاں بانٹتے دکھائی دیتے ہیں جبکہ دوسرے منطق میں بے بسی اور مجبوری کسماہٹ اور تلملاہٹ کو پروان چڑھا رہی

تھی۔

ہمارے معاشرے میں گھریلو حالات، غربت، تنگ دستی، محرومیوں اور مہنگائی کے ہاتھوں مجبور عورت جب روزگار کی تلاش میں باہر نکلتی ہے تو وہاں بھی اسے کئی پیچیدہ مسائل کا سامنا رہتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایک عورت پر اگر تشدد کیا جاتا ہے تو ان میں سے اکثر خواتین صرف ظلم سہتی ہیں یا صرف صبر کی آخری حد سے پار جاتے ہوئے خودکشی کرلیتی ہیں۔ کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ یہ معاشرہ مردوں کا ہے اس کی کہیں سنوائی نہیں ہوگی۔ آج بھی ایک مظلوم عورت انصاف کے حصول کے لیے تھانے میں اکیلی داخل ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔

پاکستانی معاشرے میں اخلاقی زوال:

بے جوڑ شادیاں عورتوں کے لیے بہت اہم مسئلہ ہے۔ دیہاتی معاشرے میں عورت ایک بوجھ ہوتی ہے اور بیٹوں کے معاملے میں نسل آگے بڑھانے کی خواہش دیہاتیوں کو بے چین رکھتی ہے۔ اس لیے کم سن لڑکے لڑکیوں کی بے جوڑ شادیوں سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ اس کے علاوہ ہمارے معاشرے میں عورتوں کا ایک اور مسئلہ چھوٹی عمر کی شادیاں ہیں۔ جس کی بھینٹ چڑھ کر صنف نازک ساری عمر چکی پستی رہتی ہے۔ یہ ظلم ماں باپ خود اپنی بیٹی کے ساتھ کرتے ہیں۔

ماں، باپ یا بھائی اگر کسی سے ادھار لیتے ہیں اور وقت رہتے وہ ادھار نہیں دے پاتے تو اس کے بدلے اپنی بیٹی کو ہی بیچ دیتے ہیں اور اس ناسمجھ کو بے جوڑ بندھن میں باندھ کر اپنی غلطی سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اور وہ لڑکی اس ادھار کا مول ساری زندگی چکاتی ہے اور اسی طرح ایک دن اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

ہمارے ہاں عورت کو زندگی گزارنے کے مساویانہ حقوق نہ ملنے کے سبب جملہ تہذیبی نشو و نما اور سماجی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ادبی سطح پر بھی عورت کا تخلیقی اشتراک اُس طور میسر نہ آسکا، جیسا کہ مغرب میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے باوجود شعری سطح پر زیب النساء مخفی (بنت اورنگ زیب عالمگیر) تا شاہدہ حسن، اور افسانے کی سطح پر عباسی بیگم، نذر سجاد، آصف جہاں اور انجمن آراء سے خالدہ حسین تک نسوانی تخلیق اظہار نے تہذیبی، سماجی اور ادبی سطح پر بھرپور اثرات مرتب کیے۔

ہمارے معاشرے میں عورتوں کے لیے ایک اور مسئلہ وٹے سٹے کی شادی کا ہے۔ اس طرح اگر ایک عورت کے گھر کوئی مسئلہ بنتا ہے تو اس کا خمیازہ دوسری عورت کو بھی بھگتنا پڑتا ہے جو کہ بالکل بے قصور اور معصوم ہوتی ہے۔ اس طرح نہ صرف دو گھروں کی زندگیاں برباد ہوتی ہیں بلکہ دونوں عورتوں کی زندگیاں بھی عذاب ہو جاتی ہیں جو اس وٹے سٹے کی شادی کی بھینٹ چڑھتی ہے۔ وٹے سٹے کا رواج خاص کر ان جاہل اور ان پڑھ گھرانوں میں رائج ہے جہاں پر عورت کی ذرا بھی قدر و قیمت نہیں ہوتی اور اسے گائے بھینس سمجھ کر کسی کے بھی پلے باندھ دیا جاتا ہے اور وہ وہیں سسک سسک کر اپنی زندگی گزار دیتی ہے۔ ظلم کی دوہری صورت اس وقت نظر آتی ہے جب باپ بیٹی کو وٹے سٹے کی شادی میں استعمال کرتا ہے اور ماں اس کو اچھے داموں بیچنے کی کوشش میں مصروف ہوتی ہے۔ سعیدہ گزدر "ایک ایسا افسانہ ہے جس میں اس ظلم کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ بھوک اور غربت کے ہاتھوں مجبور ماں بیٹی کے بکنے کو اپنی خوشحالی اور نجات کا ذریعہ سمجھتی ہے۔

”جب سے لالی بڑی ہو رہی تھی کھاتو کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح نا تھے سے چھپا کر رکھے اور دوسری لڑکیوں کے تو آنے پونے دام لگے تھے۔۔۔ لالی اپنی بہنوں میں سے سب سے خوبصورت نکلی تھی۔۔۔ خط تو چاہتی تھی کہ تھوڑا وقت اور نکال کر لالی کا ہاتھ کسی اچھے ادمی کے ہاتھ میں دے دیں اور جو دام ملے اس کی گائے خرید لے۔ لالی کو وہ اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتی تھی۔“(4)

اسی طرح کچھ لوگ مجبوری کا بہانہ بنا کر عورتوں کو بیچ ڈالتے ہیں اور کہیں رسم و رواج کے نام پر۔ آج بھی ان پڑھ اور جاہل گھرانوں میں یہ رواج رائج ہے کہ جہاں گھر کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بہو بیٹیوں کو بیچ دیا جاتا ہے اور انہیں نمائش کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں لڑکی کے ایک دفعہ دام وصول کرنے کے بعد ماں باپ کی خوائش ہوتی ہے کہ بیٹی بیوہ ہو جائے تاکہ اس کی دوبارہ قیمت لگ سکے۔ اس حوالے سے ایک افسانہ میں ایک بیٹی رنج و غم کے ساتھ اپنے باپ سے سوال کرتی ہے:

"بابا! تم چاہتے ہو کہ وہ انتقام لے؟ وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی، تم چاہتے ہو کہ میرا شوہر مارا جائے اور پھر میں تمہارے پاس واپس آ جاؤں۔ تاکہ تم مجھے میر بخش کے سپرد کر سکو۔ دوبارہ میری قیمت وصول کر سکو۔ اس کی آواز میں رنج تھا۔"(5)

صرف یہی نہیں اس کے ساتھ ساتھ ہمارے معاشرے کی خواتین کو اور بھی بہت سے ظلم و ستم برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ مرد اگر کوئی غلطی کر دے تو اسے نہ تو کوئی سزا دی جاتی ہے اور نہ ہی کوئی سوال جواب کیا جاتا ہے جبکہ عورت سے اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اسے غیرت کے نام پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے۔ پاکستانی خواتین افسانہ نگاروں نے اس نام نہاد اس تو غیرت کے انداز کو حدف تنقید بناتے ہوئے عورت کی بے وقتی اور رسم و رواج کے غیر ضروری پر تشش کی تصویر دکھائی ہے۔ مشرق کی معاشرے میں مرد با اختیار اور عورت بے اختیار ہوتی ہے۔ عورت اپنی زندگی کا اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے مرد کی محتاج ہوتی ہے۔

گوٹھوں، دیہاتوں اور قصبوں میں جرگہ اور پنچائت سسٹم ہے جس کے یقینی فوائد ہیں لیکن دراصل بعض اولوں سے یہ ظلم و ستم کی عدالتیں بھی ہیں جس کے فیصلے کے خلاف کوئی عدالت از ما بھی کاروائی نہیں کر سکتی۔ کچھ علاقوں میں عورت سے چھٹکارا پانے یا بدلہ لینے کا بہترین طریقہ یہ ڈھونڈا گیا ہے کہ پہلے عورت کو ہوس کا نشانہ بنایا جائے اور پھر بدکاری کا الزام لگا دیا جائے۔ خاص طور پر بہا کر دار اور باحیا عورت بے عزت و ناموس کی حفاظت میں پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دے اور نگاہ غلط کا جواب نہ دے۔ یہ نظر کرم زمیندار، وڈیرے یا جاگیر دار کی طرف سے ہو تو جرگہ اور پنچایتیں وڈیروں کے زیر اثر اور اشاروں پر چلنے لگتی ہیں۔ زاہدہ حنا اس حوالے سے لکھتی ہیں:

"سندھ میں کاروکاری کی شرمناک رسم کو منفعت بخش کاروبار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جیکب آباد کے چیف سردار نے اپنے اخباری انٹرویو میں بتایا کہ کاروکاری کی زیادہ تر کیس اس لیے داخل کیے جاتے ہیں کہ یا تو جرمانے کی رقم اینٹی جائے یا پھر کسی قرض سے جان چھڑائی جائے یہ رسم کسی کی زمین یا جائیداد پر قبضے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے معاشرے میں ایسے گھرانے موجود ہے جہاں پر جاہلانہ سوچ رکھی جاتی ہے۔ جہاں بیٹیوں کی نسبت بیٹوں کو زیادہ پیار اور اہمیت دی جاتی ہے اور بیٹیوں کو غیر ضروری چیز کی طرح گھر کے کونے میں رکھ دیا جاتا ہے۔"(6)

اس کے علاوہ ہمارے معاشرے میں ایسے گھرانے موجود ہیں جہاں پر جاہلانہ سوچ رکھی جاتی ہے۔ جہاں بیٹیوں کی نسبت بیٹوں کو زیادہ پیار اور اہمیت دی جاتی ہے اور بیٹیوں کو غیر ضروری چیز کی طرح گھر کے کونے میں رکھ دیا جاتا ہے۔

کھانے پینے کی چیزوں میں اختلاف کرنا، پڑھائی کے معاملے میں بیٹے کو آگے رکھنا، اور تو کو جائیداد میں بھی کوئی حصہ نہیں دیا جاتا اور عورت کو کسی چیز کا حق نہ دینا یہ ان گھرانوں میں عزت کی بات سمجھا جاتا ہے۔ عورت کو مارے معاشرے میں کمتر حیثیت دی جاتی ہے۔ عورت کی کمتر سماجی و معاشرتی حیثیت متعین کرنے میں تہذیبی و ثقافتی عوامل کی کارفرمائی ہے۔ عورت رشتے نعتوں کے ذریعے بلیک میل ہوتی ہے اور مرد کے جارحانہ اور غالب رویے کے پیچھے یہ سوچ بھی پتا ہے کہ انسانیت نرہے۔

مردوں کی برتری اور عورتوں کی کمتری کے حوالے سے ایک جگہ اس بارے میں اور تحریر ملتی ہے :

"کمپرومائز کر خود کو میرے مزآج کے مطابق ڈھالنا پڑے گا تمہیں اور شرط کیا ہے محض نام بدلنے کی تمام نام بدل ڈالو اپنی انفرادیت کو مار ڈالو مرد کا نام چمکالو۔"(7)

اسلام میں عورت اور مرد کو برابر کا مقام حاصل ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں عورتوں کی جگہ مردوں کو دی جاتی ہے اور وہی مرد پھر بڑھاپے میں ماں باپ کا سہارا بھی نہیں بنتے اور وہی بیٹیاں پھر ماں آپ کی خدمت کرنے کے کر جنت کماتی ہیں۔

ہمارے معاشرے میں عورت کو ستی کر دینے کا رو آج بھی عروج پہ ہے۔ خوشی کے موقع پر کسی ودوا کی موجودگی بد منگنی کی علامت سمجھی جاتی رہی ہے۔ بیوہ کی چوری نکا سندور شور نگوں کے لباس اور ارائش وزیبائش پر مکمل پابندی عائد کر کے اس کے ارمانوں کا قتل کر دیا جاتا ہے۔ بیوہ کی دوسری شادی پر بھی پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ اس کا یہ شوشل بائیکاٹ بعض اوقات اسے غلط راستہ منتخب کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ معاشی ضرور دیں اسے طوائف بنادیتی ہیں لیکن اسے باعزت طریقے سے شادی کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ حمیدہ بیگم اور عالم عثمانی بیگم کے افسانوں میں اس کی مثالیں دیکھیں:

"پھیروں کے بعد کچھ رسم ادا کرنے کے لیے دولہا کو اندر بلایا گیا اس وقت دیوکی سے نہ رہا گیا۔ وہ بھی وہاں پہنچی یکا یک اس کی چاچی کی نظر اس پر جا پڑی۔۔۔ رام رام، ریتوار رموں کا وقت اور دھوکا سر پہ لا کھڑا کیا۔"(8)

صدیوں سے عورتوں پر تشدد کی مختلف انداز اپنائے گئے ہیں۔ کچھ مردوں کے نزدیک عورت ان کے پاؤں کے گرد نوکر، خدمت کار اور باندی ہے ان کا خیال میں عورت پر ظلم وستم کرنا اور اسے آزمائش میں مبتلا رکھنا ہی اصل مردانگی ہے۔ مرد کو اپنی نصرت اور عورت کی ہزیمیت سے بھی سود کی حاصل ہوتی ہے۔ اپنی بیوی سے کسی نہ کسی بہانے لڑتے رہتے ہو۔ کبھی کھانا کھاتے ہوئے پانی کیوں نہیں رکھا، سالن میں گھی کی یہ کم کیوں ہو گئی، حقے کے چلم کے لیے چلنے میں اگ نہیں رہی اور مجھے دودھ کی مقدار کم کیوں دی گئی۔ جو چھوٹی چھوٹی باتوں سے عورتوں پر رعب ڈالنا مردوں کی ایک عادت بن گئی۔

پاکستان نے معاشرے کو صنفی امتیاز نے مرد اساس معاشرے کی صورت دیتی ہے جس میں عورت بے زبان مخلوق ہے۔ مرد کا عورت پر ظلم اس مردانہ معاشرے کا وطیرہ ہے لیکن اگر معاملے کی گہرائی میں جائے تو اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ عورت کی سب سے بڑی دشمن عورت بھی ہوتی ہے۔ بعض حالات میں مرد کے ظالمانہ افعال کے پیچھے اور مرد کو اکسانے والی ایک عورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر ازدواجی زندگی میں مائیں اور بہنیں بہوئیں اور باوجود کے ساتھ ہونے والے ظلم میں شریک ہوتی ہیں۔ عورت تخلیق کرتی ہے اس لیے وہ اپنی ملکیت میں گھر اور بیٹے میں شرکت داڑھی برداشت نہیں کرتی۔ اس طرح عورت کے ہاتھوں عورت ظلم وستم کا نشانہ بن جاتی ہے۔

خواتین کے نفسیاتی مسائل اور معاشرتی حل:

ساس بہو کے جھگڑے آج کل ہر گھر کی کہانی ہے جس میں دونوں عورتیں ایک دوسرے کی زندگی عذاب بنانے مصروف رہتی ہیں اور اچھے بھلے گھر کو جنگ کا میدان بنا دیتی ہیں۔ بہو گھر کی زینت ہوتی ہے لیکن سسرال والے اس کو گھر کی کام والی سمجھ کر اس پر ظلم کرتے ہیں اور بہو بیچاری جو کہ اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر آئی ہوتی ہے وہ نہیں چاہتی کہ کسی وجہ سے اس کے ماں باپ کو کوئی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ لیکن سسرال والے سمجھتے ہیں کہ بس ہمارے گھر آگئی ہے تو ہم جیسے مرضی اس پر ظلم کریں اور ظلم سہنا اس کی مجبوری ہوتی ہے۔

اس طرح عورت بہت سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتی ہے۔ ساس یہ تک بھول جاتی ہے کہ کسی زمانے میں وہ بھی بہو تھی اور اس نے بھی یہ مظالم کا سامنا کیا ہے تو اب وہ اپنی بہو کے ساتھ اچھا سلوک کرے لیکن ایسا نہیں ہوتا وہ بیچاری بہو کا کبھی اپنے والدین کی خاطر کبھی اپنے بچوں کی خاطر تمام مظالم سہتی رہتی ہے۔

اولاد کا نہ ہونا بھی عورت کو نفسیاتی مسائل میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ہر وقت کی یہ سوچ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اس کا شوہر کہیں دوسری شادی نہ کر لے اس کے ذہن پہ یہ بات اتنا اثر ڈالتی ہے کہ بعض دفعہ عورتیں اپنا ذہنی توازن کھو دیتی ہیں۔ مشرقی معاشرے میں کم علمی اور جہالت کی وجہ سے اولاد کے نہ ہونے کا سارا قصور عورت کو دیا جاتا ہے۔ پاکستانی خواتین افسانہ نگاروں نے اس اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اولاد کا نہ ہونے کا سبب صرف عورت نہیں بلکہ مرد بھی بانجھ پن کا شکار ہو سکتا ہے۔

شہناز شورو کے افسانے "پہلا کمرہ، تیسری عورت" میں "میاں جی" ایسا ہی کردار ہے جو بے اولادوں کو تعویذ دیتا ہے۔ دعائیں کرتا ہے اور لوگوں کو فیض پہنچاتا ہے۔ اس کی عقیدت مند دور دراز علاقوں سے آتے ہیں لیکن میاں جی تین شادیوں کے باوجود خود نامرد ہے۔ اس لیے وہ اپنے نوکر عبدل کو سب سے چھوٹی بیگم کے پاس بھیجتا ہے تاکہ اس کی کوکھ بھر جائے۔ اور اولادِ نرینہ کے بعد وہ عبدل کو مروا دیتا ہے:

"عبدل! جا تو اندر جا، چھوٹی بی بی کے کمرے میں، اس سے اٹھا بول میں نے بھیجا ہے۔ میں۔۔۔ میں جاؤں سرکار۔۔۔ چھوٹی بی بی کے۔۔۔ کمرے میں۔۔۔ ایسا نہ کیجئے، مجھ غریب پر۔۔۔ جا تو اپنا کام کر۔۔۔ وقت کھوتا نہ کر۔۔۔ دیر ہو گئی تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔"(9)

رائس فاطمہ کے اپنے "پل صراط" اور لبابا عباس کا "بانجھ خواہشیں" اس موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ نیلم احمد بشیر کے افسانہ "ایک اور دریا" کی سکینہ خود کو قصوروار سمجھ کر خودکشی کی کوشش کرتی ہے۔ موت کے منہ سے بچ کر کچھ عرصہ قید میں رہتی ہے اور ڈیوٹی پر موجود سپاہی کے جسمانی استحصال کے نتیجے میں حاملہ ہو جاتی ہے۔ یہ تمام باتیں مل کر عورتوں کے

نفسیاتی مسائل میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ عورتوں کے نفسیاتی مسائل میں مبتلا ہونے کی ایک وجہ صرف بیٹیوں کا پیدا ہونا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ہر چیز کا ذمہ دار عورت کو ہی سمجھا جاتا ہے۔ اگر اس کے ہاں اولاد پیدا نہ ہو رہی ہو تو بھی ذمہ دار عورت ہے اور اگر ہو کر فوت ہو جائے تو بھی ذمہ دار عورت ہے اور اگر صرف بیٹیاں پیدا ہو پھر بھی ذمہ دار عورت کو ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس ظالم معاشرے میں عورت کا رہنا دوبھر ہو گیا ہے عورت کرے تو کرے کیا؟ بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں اور ماں کے لیے تو اس کی سب اولاد ایک برابر ہوتی ہے لیکن یہ معاشرہ اس چیز کو مانے تب نہ۔

بیٹیوں والی ماؤں کو اس زمانے میں بہت ہی بری نظر سے دیکھا جاتا ہے اور تو اور اس کے گھر والے سسرال والے اور شوہر ہی اس کو تانے دے دیں کر گنہگار بنا دیتا ہے۔ ہمارا معاشرہ یہ نہیں سوچتا کہ عورت سے ہی یہ دنیا چلتی ہے اگر بیٹیاں ہی پیدا نہ ہوئی تو خاندان آگے کیسے بڑھیں گے؟ مگر ہمارے معاشرے کے لوگ اس بات کو کبھی نہیں سمجھیں گے وہ عورتوں کو اس قدر ٹیک لیف دیتے ہیں ان پر ظلم سے ڈرتے ہیں کہ وہ دن بدن نفسیاتی مسائل میں مبتلا ہوتی چلی جاتی ہیں۔

بشریٰ اعجاز کا فسانہ "آسمان اور سایہ" میں بھی اس کی ایک مثال ملتی ہے جہاں لڑکی کے ڈاکٹری علاج کی بجائے جعلی پیر کے عمل سے لڑکی حاملہ ہو جاتی ہے اور خودکشی کر لیتی ہے۔

ہمارا معاشرہ مردانہ حاکمیت پر مبنی ہے۔ عورت مرد کے سامنے کمزور مخلوق ہے۔ گھریلو زندگی سے لے کر معاشرتی زندگی کے تمام پہلو میں ہمیں صنفی امتیاز کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ عورت جسمانی طور پر مرد سے مختلف ہے۔ مرد جسمانی طور پر عورت سے قوی ہوتا ہے عورت اس کے مقابلے میں صنف نازک کہلاتی ہے۔ اس فطری جسمانی تفریق کی بجائے

مشرقی معاشرے میں عورت صنفی تفریق کا نشانہ بنتی ہے۔ ڈاکٹر آصف پرہی لکھتے ہیں:

"اس تفریق اور اس کے نتیجے میں بڑھتی جانے والی عصبیت کی بنیاد جسمانی صحت سے زیادہ سماجی تاریخ میں پنہا ہے۔ بعض ماہرین نے جسمانی تفریق Biological Difference کی بجائے صنفی تفریق کو احتصال کا مجرم ٹھہراتے ہیں کہ یہ تفریق سماجی اور ثقافتی رویوں کا نتیجہ ہے۔ قدرتی امر نہیں۔ آج کے معاشرے میں عورت کی حیثیت ایک طویل تر یکی جبر کا نتیجہ ہے۔"(10)

پاکستانی افسانہ نگاروں نے عورت کے ساتھ استحصال کی مختلف صورتوں پر تواتر کے ساتھ لکھا ہے۔ عورت کی ذہانت پیشہ ورانہ اور تخلیقی اصلاحتیں، سوجھ بوجھ، فہم اور تعقل وادراک کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ عورت کی تذلیل کا رویہ اختیار کر کے اسے احساس کمتری میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ کی راہ میں مشکلات پیش کی جاتی ہیں۔ ازدواجی

زندگی میں عورت کی ترجیحات مختلف ہوتی ہیں۔ وہ جب ماں بنتی ہے تو اس کی توجہ کا مرکز بدل جاتا ہے اور وہ اپنے بچے کی اچھی تعلیم وتربیت تعلیم اور صحت کے معاملات کو دیکھتی اپنی ذات یکسر بھول جاتی ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں نے شادی شدہ زندگی کے دورخ پیش کیے ہیں جنہیں صرف عورت بجھتی ہے مرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیوی ہمیشہ جوان، خوبصورت، نفیس اور کھلی رہے۔ مرد کو گھر کا عمدہ انتظام، صفائی ستھرائی اور بچے چاہیے۔ عورت اپنی شخصیت کو خانوں میں بانٹ کر گھر کو جنت بناتی ہے لیکن جب اسے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی ریاضیات اکارت گئی تب وہ ان حالات میں نفسیاتی مسائل کا شکار ہوتی ہے۔ عورت گھریلو ذمہ داریوں سے دستبردار نہیں ہونا چاہتی لیکن یہ خواہش بھی رکھتی ہے کہ اسے جانور نہ سمجھا جائے۔ مسرت لغاری اپنے محسوس طنزیہ انداز میں شادی شدہ زندگی میں عورتوں کی ذمہ داریاں اور فرائض کے دراز سلسلے کے نشاندہی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

”ہمارا تعلق صرف ایک مرد سے نہیں جوڑا جاتا بلکہ اس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز سے جوڑا جاتا ہے۔ اس کے گھر میں ہماری ان گنت Attachments ہوتی ہیں۔ ان کے گھر کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز سے ہمارا نکاح ہوتا ہے۔“(11)

کسی بھی وجہ سے عورت کی جنسی تسکین ممکن نہ ہو سکے اور اس کی فطری خواہشات کی تکمیل نہ ہو تو بے شار نفسیاتی مسائل جنم لیتے ہیں۔ جسم کی طلب اور مرد کی عدم توجہی کے باعث فرسٹریشن جنم لیتی ہے۔ خاص طور پر جب عورت بیرونی

دنیا میں ہر حوالے سے مطمئن ہو اور جنسی ملاپ کی ہوا س اسے ایسے وسیلے تلاش کرنے لگتی ہے جو عورت کے کردار پر تہمت ہے۔ عورت کی ذہنی اور نفسیاتی صورتحال کو سمجھنے کی بجائے اس کے جذباتی قتل کو ترجیح دی جاتی ہے۔ دنیا کی نعمتوں سے مالا مال عورت جھوٹے جذباتی رابطے استوار کر کے اس کے سنگین نتائج سے بے پرواہ ہو جاتی ہے۔

بعض دفعہ عورتوں کے نفسیاتی مسائل میں اضافہ کرنے کی وجہ نامرد شوہر ہوتا ہے۔ ایسے مرد جو جنسی عوارض یا لغزشوں کے باعث مردانگی کے جوہر سے محروم ہوتے ہیں۔ معاشرے میں اپنی عزت اور ساکھ بنائے رکھنے کے لیے عورت کی امنگوں اور جذبوں کی پرواہ کیے بغیر شادیاں کر لیتے ہیں اور عورت کی زندگی کو متواتر اور مسلسل اذیت کا نشان بنا دیتے ہیں۔ ایسے مرد اپنے کسی بھی عمل سے عورت کو باثروت بنانے کے قابل نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے بھی عورت بہت سے

نفسیاتی مسائل میں مبتلا ہوتی چلی جاتی ہے۔

مہنگائی: ایک سنگین معاشی مسئلہ:

عورتوں کو بہت سے معاشی مسائلوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جن کے سبب وہ بہت سی غلطیاں اور گناہ کر بیٹھتی نہیں۔ عورت سماجی دباؤ اور معاشی مجبوریوں کے ہاتھوں اپنے منصب سے گر کر یہ طوائف پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اپنا جسم بیچتی اور پیٹ کا دوزخ بڑھتی ہے۔ پاکستانی افسانہ نگار خواتین نے طوائفوں کی زندگی پر براہ راست افسانے شاذ ہی لکھے ہیں البتہ پاکستانی خواتین افسانہ نگاروں نے ازدواجی زندگی کی ایسی مجبور عورتوں کی تصویر کشی کی ہے جو طوائف نہیں ہے لیکن وہ سارے کام کرتی ہیں جو ایک طوائف کے کردار کے ساتھ منسوب ہیں۔ عاطف پروین کے بقول:

”جنرل یوسف۔۔۔ میرے شوہر کی کیمیکل فیکٹری کا لائسنس بھی منظور کرنا صرف اسی کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۲ بجے رات کے قریب جب مدہوشی نے لوگوں کے حواس باختہ کیا آج تک میرے پاس آیا اور فیک ٹری کے کاغذات مجھے پکڑا کر گڑ گڑانے لگا کہ میں جنرل یوسف کے پاس جاؤ اور کاغذات پر دستخط کروالوں۔۔۔ میں نے فیکٹری کے دستخط کی بات کی تو بولا ایک کیوں؟ فیکٹریوں کی پوری چین کیوں نہیں؟ پھر اس نے مجھے صوفے کی اوٹ گھسیٹ کر مجھ سے دست درازی شروع کر دی۔“(12)

ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ برائی کی دلدل میں پھنس جانے کی پس پست عوامل و عناصر اور تلے حقائق سے میں پیشت نکلنا مشکل ہے۔طوائف عورتیں حالات کے جبر کے ہاتھوں پابندی قفس ہے لیکن ازادی کے لیے بے چین ہے تو بھی اس محبت فضا سے نکل کر اڑان ان کے لیے دشوار ہے۔عورت اپنے بچوں کے پیٹ کی آگ سرد کرنے کے لیے اس داؤپر لگانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔اسے ضروریات اتنا مجبور کر دیتی ہیں کہ ان کے سامنے اپنی عزت کی بھی پرواہ نہیں کرتی۔

الغرض اور زندگی میں گود سے لے کر لحد میں اترنے تک تمام زندگی مسائل کا شکار رہتی ہے۔وہ سسرال اور مائک کا دونوں جگہوں پر کھانے پینے باہر آنے جانے تعلیم اور دیگر امور کے حوالے سے پابندیوں کا شکار ہے۔زندگی کا ناقابل برداشت معاشی بوجھ، یک رنگی اور بے کیفی کا خاتمہ یا اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو منوانے کے لیے عورت عملی میدان میں سرگرداں نظر آتی ہے۔جب وہ ہاتون خانہ بھی ہو تو اس کے کندھوں پر دوہری ذمہ داری ان پڑتی ہے۔ورکنگ لیڈی کو گھر، بچے، رشتہ دار اور جاب کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے زیادہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ایسی ہی خاتون کا نقشہ شمع خالد کے افسانے کے اس حصے میں پیش کیا گیا ہے:

"انٹر کام کے ذریعے اعلان کیا تھا کہ ان کے دوست آئے ہیں۔اب ثریا کو ان کے لیے بھی چائے بھجوانی تھی۔۔۔میں بھی ان کے ساتھ ہی گھر داخل ہوئی ہوں۔پہلے کھانا گرم کر کے دیا۔کچن میں پھیلے برتن دیکھ کر نہ رہ سکی۔پر انہیں ذرا بھی پرواہ نہیں۔ذراسا بھی احساس نہیں میری مدد کرنے کی بجائے الٹا چائے کا آرڈر دے کر کپ لگانے ڈرائنگ روم میں چل دیے۔"(13)

المیہ یہ ہے کہ عورت کے بے شمار ذہنی اور جسمانی مسائل میں کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ملازمت کرنے والی عورت کا ایک اہم مسئلہ معاشرے میں خود کو مرد کی ہوس ناک نظروں سے بچانا بھی ہے۔گھر سے باہر نکلنے والی ہر عورت کا کردار مشکوک سمجھا جاتا ہے۔گھر کے اندر اور باہر تانا کشی اور بہتان کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔نوکری کے حصول کے لیے نکلنے والی لڑکیاں پہلے طرح طرح کے شک وشبہات کا سامنا کرتی ہیں۔جن کو مختلف حربے استعمال کر کے ورگلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ہر جگہ غیر امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔کنواری ہو تو اس کو عزت و ناموس کی حفاظت کا ڈر رہتا ہے اور شادی شدہ ہو تو صرف شریک حیات ہوتی ہے رفیق حیات کا درجہ نہیں پاتی۔آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی تعلیم سے دور ہے۔پاکستان میں مجموعی شرح خواندگی کم ہے اس میں سے عورتوں کی تعلیم کا تناسب اور بھی کم ہے۔آج بھی عورت جہیز نالانے کے جرم میں چولہے پر جلائی جاتی ہے۔وہ ادھوری ہے اس کی گواہی ادھوری ہے۔وہ ذہنی اور جذباتی بحرانوں کا شکار ہے۔

عورت ذہنی اور جسمانی تشدد سہتی ہے۔آج بھی پاکستانی عورت قرآن سے بیاہی جاتی ہے اور کاری کی جاتی ہے۔خریدی اور بیچی جاتی ہے۔تحقیق و جستجو کی لگن رکھنے اور باصلاحیت ہونے کے باوجود بے بس ہے۔کثرت ازدوج کی اور طلاق جیسے ہتھیاروں سے بلیک میل ہوتی ہے۔گھریلو ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے خانوں میں بٹی رہتی ہے۔

افسانہ نگاری میں عورتوں کے مسائل کی روایت:

اردو افسانہ ایک صدی سے زیادہ کا سفر طے کر چکا ہے۔چنانچہ اس عرصے میں اردو کی ادبی روایات میں افسانے نے

نہ صرف خود کو ایک صنف کے طور پر مستحکم اور مضبوط کیا بلکہ چند ہی برسوں میں اس نے ایسی صورت اختیار کرلی کہ بیسویں صدی کی کسی بھی تخلیقی نثر کا وجود افسانے کے ذکر کے بغیر ممکن نہیں رہا۔اس دوران میں اردو افسانہ کے میدان میں عصر حاضر کے مسائل اور انسان کی شکست خوردگی کے ساتھ طبقہ نسواں کے مسائل کو خصوصی جگہ دی گئی۔

طبقہ نسواں کے مسائل کو منفرد انداز میں بیان کرنے والی خواتین افسانہ نگاروں میں رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، خالدہ حسین، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، پروین عاطف، نلوفر اقبال، فرخندہ لودھی، بانو قدسیہ، نیلم احمد بشیر، الطاف فاطمہ، زاہدہ حنا، سلمہ ایوان اور طاہرہ اقبال کے نام بہت اہم ہیں۔

خواتین نے اپنے افسانوں میں نسائی عصری حسیت اور بصیرت کا ثبوت دیا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عورت ہونے کے ناطے انہوں نے اپنی ہم جنس کے مسائل پر زیادہ توجہ دی ہے۔ عورت کے جائز اور شرعی حقوق کا مطالبہ کیا ہے بحیثیت انسان اس کی اہمیت اور وقعت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان افسانہ نگاروں کے زاویے نگاہ کو محدود سمجھ لینا درست نہیں ہوگا۔ ان کے ہاں معاشرے کے دیگر حقائق اور زاویے بھی زیر بحث آتے ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں کا اہم ترین موضوع حقوق نسواں اور آزادی نسواں کا پرچار ہے۔ پدر سری سماج کی وجہ کرتا اختدار کی وجہ سے عورتوں کے حقوق غضب کرنا اور انہیں ذہنی طور پر پسماندہ رکھنے کے لیے معاشرتی جواز تلاش کیے جاتے رہے ہیں۔ عورت کی بے لطف اور سپارٹ زندگی کا مقصد مرد کی اعلانیت کو قائم رکھنا اور اس کی رضا و رغبت حاصل کرنا ہے۔ مرد عمر میں چھوٹا ہو یا بڑا ہر رشتے کے حوالے سے اس کی فوقیت قائم ہے۔ بدکاری، بدفعلی، وحشی پن، حرام کاری، عورت پر ذہنی جسمانی تشدد اور اسے مغلظات سے نوازنا مردانگی کی دلیل اور تقاضہ تھا۔ عورت جانوروں کے ریوڑ کی طرح اپنے مالک کے رحم و کرم پر تھی جس کی سیاہ سفید کا فیصلہ سنانے والا مرد تھا۔

"ہم مشرقی لڑکیاں ایک طرح کا اناج ہوتی ہیں کہ خاندان کے بوڑھے جس کھیت میں چاہیں وہ دے یا ہماری مثال بکریوں کی ہے، جن کی قسمت کے مالک قصائی ہوتے ہیں اور جب جس وقت چاہیں ذبح کرتے ہیں۔"(14)

ہندوستانی عورت کی زندگی خدمت گزاری تک محدود تھی جس کے لیے وہ دن رات کوشاں رہتی تھی۔ خواتین افسانہ نگاروں نے اس کے متعلق اپنے کرداروں کے ذریعے سوال اٹھایا ہے۔

بچپن بھائی باپ کی خوشامد اور خدمت میں، جوانی شوہر کی تابعداری میں، بڑھاپا بچوں کی دلداری میں تو گویا ہمارا یہ جسم ہمارا نہ ہوا۔ یہ ایک خاص قسم کا انجن بن گیا جس کی کل جدھر چاہو موڑ دی۔"(15)

خواتین کا رجحان انگارے کی اشاعت سے ہی نظر آتا ہے۔ انگارے میں شامل رشید جہاں کے افسانے خواتین افسانہ نگاروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ رشید جہاں طرز فکر میں انقلابی تھی۔ انہوں نے افسانے کو اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا، اس لیے خواتین افسانہ نگاروں پر رشید جہاں کا بہت گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ انگارے سے پہلے تہذیب نسواں، عصمت اور نارنگ خیال جیسے جرائد میں خواتین کی تحریریں چھپ رہی تھیں۔ ان جرائد نے عورتوں کی ادبی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ ان رسائل کے ذریعے خواتین کہانی کاروں کی پہلی نسل پروان چڑھی۔

ان خواتین نے مخصوص مقاصد کے تحت اوروں میں تعلیم پھیلانے اور پلی لکھی عورتوں میں علمی و ادبی ذوق اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی رہیں۔ خواتین نے اپنے افسانوں میں نسائی عصری حسیت اور بصیرت کا ثبوت دیا۔ خواتین کے جائز اور شرعی حقوق کا تقاضہ کیا۔ خواتین افسانہ نگاروں کا اہم ترین موضوع خواتین کے حقوق کی پاسداری اور آزادی کا پرچار ہے۔ انہوں نے براہ راست اور کبھی اپنے کرداروں کے ذریعے سماج کے رویوں اور برائیوں کی نشاندہی کی ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں نے ان منظوم اور فرسودہ روایات کو بھی موضوع بنایا ہے جس کی وجہ سے وہ بیوہ ناپاک اور بدقسمت قرار دی جاتی تھی۔

ان افسانہ نگاروں نے گھریلو سیاست اور سازشوں کی نظر ہونے والی عورت کو بھی اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے اور منفی رویوں کو کردار کے ذریعے پیش کیا۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں خواتین کے جو الگ پرچے شائع ہونے شروع ہوئے ان سے خواتین میں جہاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا وہی ان میں یہ شور بھی بیدار ہوا کہ وہ اپنے مسائل دکے چھپے الفاظ میں بیان کرنے کی بجائے کھلم کھلا ان کا اظہار کر سکیں۔ پہلے پہل یہ زنانہ رسائل مرد حضرات نکالتے تھے لیکن بعد میں خواتین بھی ان میں شامل ہونا شروع ہو گئی۔

انگارے سے قبل رسائل تہذیب نسواں، عصمت اور نیرنگ خیال وغیرہ میں خواتین کے افسانے شائع ہوتے تھے۔ ان خواتین نے اپنے عہد کے تناظر میں عصری تقاضوں کو قریب تر محسوس کیا اور بصیرت اور بہتر حکمت عملی اپناتے ہوئے افسانے لکھے۔ انیسویں صدی کے نصف اخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک ہندوستانی معاشرے میں شعر و ادب کی دنیا پر مرد تخلیق کار چھائے ہوئے نظر آتے ہیں مگر اس کے برعکس عورت سماجی مذہبی اور اخلاقی پابندیوں کا شکار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شعر و

ادب کے میدان میں مردوں کے مقابلے میں خواتین کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے۔ہندوستانی سماج میں عورت پر ذہنی اور عملی ترقی کے دروازے تقریبا بند تھے۔ تعلیم اور سماجی رابطوں کا دائرہ محدود تھا۔یورپ میں عورت کی حالت زار میں تبدیلی کے نتیجے میں برصغیر میں آزادی نسواں کا شور پیدا ہوا۔

حوالہ جات

1۔احمد دہلوی،سید،فرہنگِ آصفیہ،اردو سائنس بورڈ،لاہور،2010ء،ص176

2۔نورین رزاق،اردوافسانے کی روایت اور پاکستانی خواتین افسانہ نگار، تحقیقی وتنقیدی مطالعہ،(مقالہ برائے ایم فل اردو)،پنجاب یونیورسٹی،لاہور، 2012ء،ص581

3۔اردولغت تاریخی اصولوں پر،(جلد اول)،ترقی اردوبورڈ،کراچی، 1997ء،ص613

4۔سعیدہ گزور،لالی، سمیع سنز پرنٹرز،کراچی،س ن،ص116۔117

5۔سائرہ ہاشمی،اور وہ کالی ہوگئی(زندگی کی بند گلی)،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،1995ء،ص19

6۔زاہدہ حنا،پاکستانی عورت، تخلیق کار پبلشرز،دہلی، 2006ء،ص89

7۔ شہناز شورو، مضمون:پناہ،مشمولہ:لوگ لفظ اور انا،بن مسلم پرنٹنگ پریس،کراچی، 1997ء،ص50۔51

8۔حمیدہ بیگم،اندھیاجیون کا دیا،مکتبہ الحسنات،دہلی، 1982ء،ص82۔83

9۔ شہناز شورو، مضمون:پہلا کمرہ تیسری عورت،مشمولہ:لوگ لفظ اور انا،ص195

10۔آصف فرخی،بیماریوں کے محل میں ہراساں عورت،مکتبہ پیام،نئی دہلی، 2005ء،ص205

11۔مسرت لغاری، مضمون:بیگم صاحبہ،مشمولہ:اساطیر،لاہور،1987ء،ص97

12۔پروین عاطف، مضمون:آویزہ،مشمولہ:تسطیر کی کہانیاں،لاہور،س ن،ص141۔142

13۔ شمع خالد،خواب بکتے ہیں،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،2004ء،ص123

14۔حجاب علی امتیاز،نادیدہ عشق،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،1992ء،ص105

15۔شفیق بانو،باغی لڑکی،بھٹی پریس،دہلی، 1940ء،ص700